

دیکھا جاتا بلکہ اس پر واضح کر دیا گیا کہ ٹریننگ کے خاتمے پر اسے بہر صورت جہاد کے لیے جانا ہو گا.. یہاں سے واپسی کی کوئی گنجائش نہ تھی..  
تو یہ مرتضیٰ بیگ تھا..

قندوز میں مرتضیٰ بیگ تھا.. ایک ایسا شہر جس کے نام سے بھی وہ ناواقف تھا اور وہ ایک کلانکوف سنجھا لے ایک گہری کھائی میں چھپا کئی روز کی نقاہت اور بھوک سے نڑھاں ان دیکھے دشمن پر بے تحاشا فائر کر رہا تھا.. لاشون کے انبار میں پھنسا ہوا فائر کر رہا تھا..  
کیوں؟

ایک رد عمل کے نتیجے میں.. یادل میں سے زندگی کی لا یعنیت کی جو ہو ک اٹھتی ہے اسے جواز دینے کے لیے... لیکن بہر طور ایک کفارہ ادا کرنے کے لیے.. اور اس کے لیے اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی قندوز کی اس کھائی میں.. جہادی ٹریننگ کے باوجود وہ اتنی اذیت اور لاچارگی کے لیے تیار نہ تھا.. آسمانی دشمنوں کے لیے تیار نہ تھا..

اس دوران اس کے لب بھخے رہے.. دانت ٹوٹنے کو آئے اور صرف ایک مرتبہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے گرد آلود چہرے میں سے نمایاں ہوئی جب اس نے اپنے چیتا برانڈ جو گرگز پر ایک نظر ڈالی.. یہ واقعی مرتبہ دم تک ساتھ دے رہے تھے..

شیزان سے الفلاح بلڈنگ تک مال روڈ کے فٹ پاٹھ کے کنارے کہیں بھی کار پارک کرنے کے لیے جگہ نہ تھی.. اس نے متعدد پھیرے لگائے اور پھر زیر لب ”رشٹ“ کہہ کر ایک چھوٹی سی سوزوکی کے عین پیچھے اپنی بڑی سی بی ایم ڈبلیوڈبل پارک کر دی اور اطمینان سے سروں کے ٹشو شور میں داخل ہو گیا...

شوکیس میں جو گرز اور ہائنگ بولٹس کی ورائی نمائش پر تھی اور وہ ہر ایک کو غور سے دیکھتا جانچتا اندر داخل ہوا تھا..

”آپ کو کس قسم کے جو گرز درکار ہیں سر..“ سیلز مین نے اس کا پاؤں ناپ کے تنخے میں فٹ کرتے ہوئے دریافت کیا..

”جو پہاڑوں کی سختیاں برداشت کر سکیں..“

”اچھا تو آپ شہابی علاقوں میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں .. نانگا پربت اور کے ٹوکی جانب..“

”میں پہاڑوں کی طرف جا رہا ہوں .. مجھے ایسے جو گرز درکار ہیں جو صمرا اور پہاڑوں میں یکساں کار آمد ہوں“

سیلز مین نے چیتا بر انڈ جو گرز کا ایک جوڑا اٹبے میں سے نکال کر اس کے تسلیم کرنے اور اس کے پاؤں کے آگے رکھ دیئے.. ”جناب ان دونوں یہ بہت پاپولر ہیں .. پاکستانی مید ہیں .. بہت مضبوط ہیں .. مرتبے دم تک ساتھ دیں گے ..“

واقعی وہ مرتبے دم تک ساتھ دے رہے تھے..

اس نے چھپلے تین ہفتوں سے اپنے پاؤں ان میں سے نہیں نکالے تھے .. اسے ڈر تھا کہ ان کے اندر اس کے پاؤں کی وہی حالت ہو گی جو اس کے ایک ساتھی کے پاؤں کی تھی .. کچھڑا اور پانی ان کے اندر مسلسل سرات کرتا رہا تھا .. پہنچنے سے ان کے اندر جو جرایں تھیں وہ نچڑتی رہتی تھیں اور اس ساتھی نے جب جو گرز کے بعد جرایں اتارنے کی کوشش کی تو جلد کاماس بھی ساتھ ہی اترتا گیا .. پاؤں اتنے گل چکے تھے ..

قندوز کی خند قیں لاشوں سے اٹی پڑی تھیں اور مرتضی بیگ ان میں پھنسا

ہوا فارز کرتا جا رہا ہے .. کسی ان دیکھے دشمن پر یا ارضی بیگ کی اس نگین تصویر پر جو  
اس کے افغانی جہاد کے کارناموں کی کتاب کے سرورق پر تھی ..  
اس لمحے اسے علم نہ تھا کہ برابر کی خندق میں کوئی پیچی ابوطالب نیم  
مدھوش پڑا ہے ..

اور نہ ہی ابوطالب جانتا تھا کہ جس خندق سے مسلسل فارز جا رہا ہے وہاں  
کوئی مرتضی بیگ بھی ہے ..

اللہ بخش، عبد الوہاب، گل شیر ولی، ہاشم میر اور جانی واکر بھی وہیں کہیں  
تھے اور ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر تھے ..

اور اب وہ ہزاروں برسوں سے ایک دوسرے کی خبر رکھتے تھے .. یہیں پیدا  
ہوئے تھے اسی تھہ خانے میں ..

یہاں قلعہ جنگلی کے ایک تھہ خانے میں ..  
جب کہ باہر صبح ہو رہی تھی اور .. ایک گھوڑا امر پڑا تھا ..

دھوپ دوسری سیرھی تک آگئی تھی ..

اوپر جہاں سے دھوپ اترتی تھی قلعہ جنگی کے صحن میں بکھری لاشوں  
میں سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی ..

دھوپ کی تیزی سے وہ سوکھ رہی تھیں اور ان کے گوشت میں جہاں  
کہیں کچھ نمی باقی تھی وہ بھاپ بن کر اٹھتی تھی ..  
گیارہ بجے تھے ..

دھوپ دوسری سے تیسرا سیرھی پر تب اترتی جب سورج لاشوں کے  
میں سر پر آ جاتا.. اس کے ڈھلنے سے روشنی پھر سے پہلی سیرھی کی جانب سر کنے  
لگتی ..

چونکہ وہاب دوسری سیرھی پر تھی اس لیے گیارہ بجے تھے ..  
یہ پیانہ وقت ابوطالب کا اختراع کر دہ تھا ..

اس کا گاؤں چیچنیا کی بڑی آبادی والی بستیوں سے طویل فاصلوں پر  
 DAGستان کی سرحد کے قریب تھا.. گاؤں کیاڑھلوان چھتوں والے چند گھر تھے جو  
 ایک تنگ وادی کے دہانے پر ہرے بھرے کھیتوں میں بکھرے ہوئے تھے... سما  
 کے دو تین ماہوں گھروں میں بند رہتے آگ پر جھکے رہتے اور ان کے چہرے دھویں  
 سے سیاہ پڑ جاتے... ان کے گھروں کے دروازے مشکل سے ہی کھلتے کہ برف ان

کی کمر تک آ جاتی .. زیر زمین تہہ خانوں میں بند مویشیوں کو خشک چارہ ڈالنے اور ان کا دودھ دو بنے کے سوا انہیں اور کوئی کام نہ ہوتا .. اس دوران دودھ .. خشک پیپر اور کبھی کبھار خشک سبزیوں کا شوربہ اور روٹی ان کی خوراک ہوتی .. سردیوں کے دوران ان کے دروازے برف کے بو جھ سے اتنی مضبوطی سے بند رہتے کہ انہیں کندھی لگانے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی اور جب وہی دروازے آپس میں بھڑنے لگتے ان کی نچولوں میں سے رات کو آوازیں آنے لگتیں تو وہ جان جاتے کہ موسم سرمرا رخصت ہونے کو ہے اور باہر برف کا بو جھ کم ہو رہا ہے، پکھل رہا ہے .. ایک کہاوت تھی کہ جب سردیوں میں دروازہ ذرا سادھکیلنے سے کھل جائے تو اس کے اندر جو مہماں داخل ہوتا ہے وہ موسم بہار ہے ..

ابو طالب کی دادی نفیسہ خاتون موسم بہار کا استقبال اپنی حُجّی میں پہاڑی تمبا کو بھر کر ایک لمبا کش لگا کر تھیں اور اس کی خوبیوں سوچیں جاتی یہاں تک کہ وادی کے دوسرے گھروں کے مکین بھی اس کی مہک پا کر اپنے دروازے واکر دیتے .. اور پر بلند کھساروں پر برف پکھلتی تو ان کی شک وادی میں جھرنے آتی نے لگتے اور جہاں کہیں کوئی چنان ہوتی، وہ آبشار میں بدلت جاتی .. سنہری چونچ والے عقاب اپنے گھونسلوں سے نکل کر وادی پر پرواز کرنے لگتے ..

ابو طالب کو اس کی دادی نے پالا تھا .. اس کے ماں باپ کا جھنوپڑا اس بڑے سیلاں کی زد میں آگیا تھا جو مقامی ندی میں ایک عرصہ پہلے پھروں کو دھکیلتا وادی کو بہا کر لے گیا تھا .. اسے ان کی شکل بھی یاد نہ تھی ..

ابو طالب نے ابتدائی تعلیم وادی کے دامن میں آباد ایک بڑے گاؤں کی مسجد میں حاصل کی اور پھر وہ کاشتکاری میں جنت گیا .. دادی نفیسہ خاتون اب بھی مویشیوں کو ہاٹ سکتی تھیں اور بھیڑوں کی دیکھ بھال کر سکتی تھیں .. وہ ہمیشہ سے یہاں نہیں رہتے آئے تھے ..

یہ ایک نوآبادی تھی..

تاتاریوں کے علاوہ ہمیشہ سے چیچنیا کے باشندوں کو بھی خود سر اور شورش پسند گردانا جاتا تھا کہ یہ لوگ مرکز کا تسلط برداشت نہیں کرتے تھے اور ہمہ وقت بغایت پر آمادہ رہتے تھے.. اس مسئلے کا حل جوزف شان نے اپنے مخصوص انداز میں کیا اور چیچنیا کی پیشتر آبادی کو زبردستی مركوں پر ٹھونس کر دور دراز کی سوویٹ ریاستوں میں بکھیر دیا اور ان پر پابندی لگادی کہ وہ ان ریاستوں سے باہر کبھی بھی قدم نہیں رکھ سکتے.. اس کے باوجود بہت سے خاندانوں نے اپنے آبائی وطن لوٹنے کی کوشش کی.. پکڑے گئے اور پھر سائبیریا کے بیگار کیمپوں میں مشقت اور سردی کا شکار ہوئے.. ایک عرصے بعد حکومتی پالیسی میں تبدیلی ہوئی تو انہیں وطن واپس جانے کی اجازت ملی..

طویل قیام کے باوجود.. مقامی لوگوں میں شادیاں کرنے کے باوجود ان ریاستوں میں چیچنیا کا کوئی ایک باشندہ بھی ایسا نہ تھا جس نے وہاں ٹھہر نے کو ترجیح دی ہو.. ابوطالب کے ماں باپ اور عزیز واقارب جب وطن لوٹے تو ان کے آبائی گھروں کی جگہ کئی منزلہ فلیٹ تعمیر ہو چکے تھے.. پگڈنڈیوں کی جگہ شاہراہوں نے لے لی تھی اور وہاں رُوسی اور یوکرین نژاد باشندے ایک عرصے سے آباد تھے... بلکہ اب وہاں ان کی دوسری نسل کی اجارہ داری تھی جو اپنے آپ کو چیچنیا کے شہری گردانتے تھے..

ابوطالب کے خاندان کو اپنے آبائی گاؤں سے سینکڑوں کلو میٹر ڈور داغستان کی سرحد کے قریب یہ تنگ وادی بے آباد ملی اور وہ اس میں آباد ہو گئے.. ابوطالب یہیں پیدا ہوا اور اس کے باپ نے گھر سے باہر نکل کر بندوق سے متعدد فائز کر کے وادی والوں کو خبر کی کہ اس کے ہاں ایک پہاڑی عقاب کی پیدائش ہوئی ہے.. اس وادی میں امام شامل کی شجاعت کے قصے دو ہرائے جاتے تھے..

اُن کے نام کی قسم کھائی جاتی تھی..

ابو طالب ان قصتوں کو برف آلود راتوں میں دادی نفیسہ سے سنتا جوان ہوا تھا.. وہ اکثر اسے داغستان کے شاعر رسول حمزہ کی وہ نظم سنایا کرتی تھیں جو اس نے شرمندگی کے بوجھ تلے دب کر لکھی تھی۔

رسول نے اپنی جوانی میں سو دیت پر دلو گندے سے متاثر ہو کر کہ امام شامل دراصل بر طانیہ اور ترکی کے جاسوس تھے جن کا کام قوموں کے درمیان نفرت کی ہوا دینا تھا اُن کی تکذیب میں ایک ہجو لکھی تھی اور اپنے تینیں امام شامل کا ”پردہ فاش“ کیا تھا... پھر وقت کے گزرنے سے، جوانی کا بخار اُترنے سے.. اور ہم وطنوں کے چہروں پر اس نظم نے جو دکھ دیا تھا اسے پڑھتے ہوئے.. اسے احساس ہوا کہ یہ ایک حماقت تھی.. اس کے والد بھی اکثر بُر بڑا تے ”رسول.. امام شامل سے مت اُلجمھو.. اگر تم نے ایسا کیا تو زندگی بھر سکون نہ پاسکو گے..“ یہ دُعا تھی یا بد دعا لیکن رسول حمزہ کو تب تک چین نہ آیا جب تک اس نے ایک اور نظم لکھ کر امام شامل کے سامنے ایک مجرم کی مانند سر جھکا کر معافی نہ مانگ لی.. نفیسہ خاتون ابو طالب کو یہی نظم سنایا کرتی تھیں....

برسون پہلے، دل پر میرے زخم لگا تھا

اب بھی نشتر بن کر جاگ امتحنا ہے..

بوڑھا، ویر، بہادر

تفقاڑی ٹوپی اوڑھے دیکھ رہا ہے...

اک اوپھی دیوار سے نیچے جھانک رہا ہے...

دائمیں ہاتھ سے پکڑے اپنی دودھاری تکوار کا قبضہ..

دائمیں جانب ڈال رہا ہے میان کا سایہ

میں نے بھی باتوں میں آگر  
 اور وہ کے ہمراہ چلا میں  
 شعروں کی شمشیریں اُس پر ..  
 وہ تلوار اجداد کی میرے ...  
 جو دشمن کے خون میں نہائی،  
 اُس کو میں نے،  
 لوگوں کی باتوں میں پڑ کر،  
 غداروں کا حربہ سمجھا...  
 دشمن کا ہتھیار بتایا...  
 اب بھی رات کی خاموشی میں ..  
 اُس کے بھاری قدموں کی آہٹ ملتی ہے،  
 جب دیپک بجھ جاتے ہیں.  
 کھڑکی میں سے اس کا سایہ  
 وہ جس نے جم کر اخلنگوکی آن بچائی...  
 گونیپ کا درولیش سپاہی ...  
 .. آ جاتا ہے، خود میرے اپنے کمرے میں ...  
 آ جاتا ہے اور یہ کہتا ہے  
 "کتنی جنگیں لڑتا آیا  
 کتنا خون بہلایا میں نے  
 کتنا درد اٹھایا میں نے  
 میرے بدن پر، میری قبار  
 انیس زخموں کے پیونداب بھی دیکھے جاسکتے ہیں

پھر بھی میں نے صبر کیا تھا  
 لیکن تم نے  
 شعروں کے یہ تیر چلا کر  
 زخم لگایا ہے ایسا  
 جیسا زخم کبھی نہ کھایا..  
 خبر کے، تلوار کے اور گولی کے زخم ایک طرف  
 اور یہ زخم ایک جانب  
 یہ پہلا زخم ہے جو میں نے  
 اپنے کوہستان کے ایک بیٹے کے ہاتھوں کھایا  
 تم نے وہ جو تیر چلا  
 میرے دل میں جاترا ہے..  
 ہو سکتا ہے غزوہ اور جہاد کے نعرے  
 اب فرسودہ سمجھے جائیں  
 لیکن میرے بچے،  
 ان نعروں نے  
 اک دن تیرے  
 کوہستان کی محترمۃ اور اُس کا ناموس بچایا  
 ہو سکتا ہے آج کی دنیا..  
 ان حربوں کو کہنے سمجھے  
 لیکن یہ وہ حربے ہیں  
 جو آزادی کے ضامن بن کر  
 رن کے میدانوں میں چکے

دشمن پر طوفان سے ٹوٹے  
میں کوہستانی شاہین بن کر  
ہر پل جنگ کے میدانوں میں لڑتا آیا۔“

یوں ہی سحر تک وہ سایہ ..

جو ہر شب اندر ہمارے میں

اپنی حنا آلو داداڑی

چہرے کی تابانی لے کر

میرے کمرے میں آتے ہی

منڈلاتا ہے ...

طنز کے لاکھوں تیر چلا کر

مجھ کو اپنے زخم دکھا کر

شم کا اک احساس دلا کر

جانے کہاں پھر چھپ جاتا ہے ..

میں نے جو حرکت کی تھی ..

اُس حرکت پر نادم ہوں

اُس سائے سے بھی نادم

جو ہر شب تاریکی میں منڈلاتا ہے ...

لفیسہ خاتون یہ نظم سناتی سناتی اپنی حقیقی سے پہاڑی تمباکو کا آخری کش لگا

کراونگھ جاتیں ..

ماں کو والے اگر چہ دہریے تھے اور ناپسندیدہ تھے لیکن اس کے باوجود ان

میں انتظامی صلاحیتیں الیکی تھیں کہ ان کے دور افتادہ گاؤں میں بھی بھلی تھی ..

اس لیے فریج تھے میلی ویژن تھا اور ایک پکی سڑک ان کے گھروں تک آتی تھی ..  
 یہ سب کچھ ہونے کے باوجود نفیسہ خاتون ایک گھری ایک الارم کلاک کی موجودگی  
 برداشت نہ کرتی تھیں .. ان کا کہنا تھا کہ اگر پہاڑوں کے بیٹوں کی کلائیوں پر  
 گھریاں بند ہی ہوں اور ان کی تپائی پر الارم کلاک دھرے ہوں تو وہ صرف ان پر  
 نظر کرتے رہتے ہیں اور آفتاب کی پہلی کرنوں .. چٹانوں کے بڑھتے ہوئے  
 سایوں اور شاموں کے سحر کو نظر انداز کر دیتے ہیں .. چنانچہ وہ گرمیوں کے موسم  
 میں کھڑکی میں سے آنے والی خنک ہوا کو اپنے بوڑھے بدن پر محسوس کر کے اسے  
 بیدار کر دیتیں کہ ابوطالب اٹھو ٹھر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے .. اس طور وہ ان کے  
 گھر کے عین سامنے جو چٹان بلند ہو کر وادی کو تنگ کرتی تھی اس پر چھاؤں کو  
 اترتے ہوئے .. ایک خاص پھر تک اترتے ہوئے دیکھ کر ظہر کی نماز کا تعین کرتی  
 تھیں .. اور جب وہ چھاؤں چٹان کے دامن میں آجائی تو عصر کا وقت  
 ہوتا .. بھیڑیں شام اترنے سے جب بے چین ہو کر باڑے کی جانب ممیاٹی ہوئی  
 چلنے لگتیں تو یہ مغرب تھی .. اور مکمل تاریکی چھا جانے کے بعد جب وہ دنبے کی چربی  
 کے شور بے میں روٹی بھگو کر کھا حکتے تو یہ عشاء کا وقت ہوتا .. اسی لیے قلعہ جنگی  
 کے تہہ خانے کی سڑیوں پر اترتی دھوپ اور چاندنی سے وقت کا اندازہ کر لینا  
 ابوطالب کی اختراع تھی ..

اُسے یقین تھا کہ اُس کی دادی اگرچہ اُس کی جدائی میں نہ ہال .. ان  
 سڑیوں پر اترتی دھوپ اور چاندنی کو دیکھ سکتی تو نماز کے اوقات کا اندازہ لگا سکتی  
 تھی ... اگر وہ اب تک زندہ تھی تو ... اسے دہشت گرد قرار دے کر ہلاک نہیں  
 کر دیا گیا تھا تو ..

وہ اپنی بھیروں اور کاشکاری میں مگن تھا جب ایک رات نفیسہ خاتون  
 نے اس کے شانے کو جھنجوڑ کر اسے بیدار کیا۔ ”غزوہ اور جہاد کے نعرے“ بھی

فرسودہ نہیں ہوئے میرے بچے.. امام شامل میرے خواب میں آئے تھے اور وہ کہتے تھے کہ کوہستان کی محترم اور ناموس کو بچانے کے لیے گروزی پہنچو.. ”  
گروزی ابھی آباد تھا.. چیچپنیا کا دل تھا.. ماسکو کا ہم پلہ تھا.. اور وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہندر میں بدل گیا..

جب اُسے رو سی ٹینک ملے کے ڈھیر میں بدل رہے تھے اور اس ڈھیر میں ہزاروں بچے بوڑھے اور عورتیں دفن ہو رہے تھے تو ابوطالب کے شانوں کے ساتھ شانہ ملائے کچھ مکمل اجنبی بھی تھے جو دور دیس سے آئے تھے.. ان میں عربی، پاکستانی، سوڈانی اور افغانی بھی تھے.. افغانی تعداد میں زیادہ تھے.. اور ان میں سے بہت سے گروزی کے ملے میں بے نام دفن ہوئے..  
ابوطالب.. اگر قندوز میں تھا.. اور اب اس تھہ خانے میں تھا تو اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے تھا.. اگر یہ وہاں تھے تو اسے بھی یہاں ہونا چاہیے تھا.. انہوں نے اس کا ساتھ دیا تھا..

شمیلی رو سیوں کا ساتھ دے رہے تھے.. تو وہ کیسے ان کا ساتھ دے سکتا تھا.. تو ابوطالب.. جسے چیچپنیا کے حوالے سے پیچی بھی کہا جاتا تھا یہاں قلعہ جنگل کے ایک تھہ خانے میں تھا.. بے شک نیم مردہ تھا..

جب کہ باہر صبح ہو چکی تھی..

ڈھوپ دوسرا سیرھی پر تھی..

گیارہ نج کچکے تھے..

اور ایک گھوڑا مردہ یڑا تھا..

ڈھوپ تیسری سینٹری پر براجمن تھی ..  
 اور پر .. کچے صحن میں بکھری لاشوں میں سے ابھی تک بھاپ اُٹھ رہی  
 تھی ..

وہ نڑھال پڑے تھے لیکن ان سب کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ گھوڑے  
 کی جانب دیکھتی تھیں .. بھوکی آنکھیں ایک مردہ گھوڑے میں سے زندگی کی بینائی  
 تلاش کرتی تھیں .. اور پچی پچی کی آنکھیں ایسی تھیں کہ بھوک سے مرنے والی  
 تھیں اور وہ زندگی کی آوازیں تھیں اسی لیے پچی پچی نے بولنے کی ہمت کی ”اسے  
 کھلایا کیسے جائے؟“

عبد الوہاب کے جہے میں تھوڑی سی کپکاپاہٹ ہوئی، وہ بہت دری سے  
 اوندھا پڑا تھا اور اسے بہت دریگی سیدھا ہونے کی کوشش میں۔ اس کے منہ میں  
 مٹی بھری ہوئی تھی۔ یہ مٹی بہت دری سے اس کے منہ میں تھی لیکن ابھی تک نم  
 ہو کر کچھری میں بدلتی تھی کیونکہ اس کے منہ میں لعاب کب کاشٹک ہو چکا تھا،  
 جن خلیوں سے وہ پھوٹتا تھا وہ مردہ ہو چکے تھے اس لیے مٹی ابھی تک خشک تھی ..  
 عبد الوہاب نے اس مٹی کو تھونکنے کی سعی کی تو وہ غبار بن کر اس کی آنکھوں کے  
 سامنے تن گئی اور وہ کھانے لگا ..

تھوڑی دری بعد اس نے اپنے پرقبا بولایا اور انک انک کر بولا ”یہ.. حلال ہے؟“

مرتضی بیگ کی گویائی کو شدید غصے نے ابال کر رواں کر دیا۔ یہ تم نے پہلے بھی پوچھا تھا وہاب.. اور میں نے کہا تھا کہ اگر حلال نہیں تو کیا تم اسے نہیں کھاؤ گے اور تم نے کہا تھا.. پھر بھی کھاؤں گا... کہا تھا یا نہیں؟“

”کیا پتہ میں نے کیا کہا تھا اور تم نے کیا جواب دیا تھا.. پچھے یاد نہیں... مجھ سے جھگڑو مت مرتضی.. ہم یہاں اس تھے خانے میں کب آئے تھے.. کتنے روز ہو گئے ہیں.. پچھے یاد ہے؟“

”نہیں.. اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم یہاں کب آئے تھے لیکن ہم یہاں آکر کہیں جانے کے لیے نہیں آئے.. سمجھ لو کہ ہم یہیں پیدا ہوئے تھے.. اور گھوڑا مکروہ ہوتا ہے اور اسے کھایا جاسکتا ہے.. اور تم تو شرعی احکام کو مجھ سے بہتر جانتے ہو.. اپنی زبان میں انہیں پڑھ کر درست نتیجے پر پہنچ سکتے ہو.. اور ہم تو جس راستے پر تم چلاتے ہو آنکھیں بند کر کے چلتے جاتے ہیں تو تم یہ بھی تو جانتے ہو کہ مجبوری کی حالت میں حرام بھی حلال کر دیا گیا ہے..“

”ہی ہی.. ہو ہو.. ہی ہی..“ اللہ بخش کی غیر تہذیب یافتہ بُنْسی کی آواز گونجی ”اگر ہم مجبوری کی حالت میں نہیں ہیں تو اور کون ہے.. بھائی مرتضی مجھے وہ گانا یاد آ رہا ہے کہ عشق میں کیسی مجبوری... وہ گانے والی اس تھے خانے میں ہوتی ناں تو اس کو لگ پتہ جاتا کہ عشق میں کیسی کیسی مجبوری ہوتی ہے.. نہیں؟“ عبد الوہاب اس حوالے کو سمجھ نہ پایا اور بولا ”ہاں مجبوری کی حالت میں حرام کھانے کی بھی اجازت ہے گھوڑا تو پھر بھی مکروہ ہے.. لیکن ہم اسے شوٹ کرنے کی بجائے حلال کر لیتے تو اچھا نہ تھا..“

”ڈونٹ وری..“ جانی نیلے ڈرموں کی اوٹ میں پڑا تھا وہاں سے اس کی خفیف سی آواز سنائی دی ”میں نے اسے شوٹ کرنے سے پیشتر بسم اللہ پڑھ لی تھی، اسے حلال ہی سمجھو..“

”لیکن یارا وہ تو شکار کے لیے اجازت ہے.. جنگل کا جانور اور پرندہ کے لیے..“

”خان صاحب ہم نے اسے شکار ہی تو کیا ہے قلعہ جنگل کے لاشوں کے جنگل میں .. آ جاؤ..“

وہ سب اپنے اپنے مقام سے کسی ڈراؤنی فلم میں قبروں سے اٹھنے والے مردوں کی مانند اپنے بھوکے ڈھانچے گھستیے ہوئے اٹھے.. رینگتے ہوئے... مرتفعی۔  
دہاب اور پیچی کے پاس پہنچنے لگے جو گھوڑے کے نزدیک تھے..  
البتہ ہاشم میر جہاں پڑا تھا وہیں پڑا رہا.. ہلا جلا نہیں.. باقی سب حرکت میں آئے لیکن وہ بے حرکت رہا..

”اے جھنجوڑو..“ مرتفعی پیچی سے مخاطب ہوا ”зор زور سے جھنجوڑو.. انسان اگر کئی روز سے بھوکا پیاسا ہو تو نقاہت اسے ایک مرگ غنوڈگی میں لے جاتی ہے جہاں سے بعض اوقات واپسی نہیں ہوتی.. اے جھنجوڑو“  
پیچی سے شاید اٹھانے کیا اور اُس نے وہیں سے لڑکھڑاتی آواز میں کہا ”اگر وہ اس حالت میں ہے تو خوش بخت ہے۔ اُس کا امتحان ختم ہو گیا.... کیا فائدہ اُسے مزید اذیت دینے کا.. اے غنوڈگی میں ہی مر جانے دو“  
”ابو طالب.. پلیز ہمت کرو اور اُسے تھوڑا سا جھنجوڑو تو سہی.. یہ کتنی ذور سے یہاں آیا ہے..“

ابو طالب پیچی پیچی اٹھا نہیں ایک چوپائے کی مانند گھستتا ہوا ہاشم کے قریب ہوا اور اس کا کندھا پکڑ کر ہولے ہولے ایک افینی کی مانند ہلانے لگا کہ سکت بس اتنی ہی تھی.. وہ بے حد ٹھنڈا الگ رہا تھا.. جیسے ڈیپ فریزر میں ہو ”... اس کا امتحان واقعی ختم ہو گیا ہے.. میرا خیال ہے مر گیا ہے..“  
”نہیں .. نہیں ..“ ہاشم کے مخدملب کھلے اور پیچی پیچی نے نہیں دیکھا تھا

کہ اس کی آنکھیں بھی کھلی ہیں.. اور تاریکی میں یہ بھی نظر نہیں آتا تھا کہ وہ روتے روتے سرخ ہو چکی ہیں ”میں ابھی ہوں.. مجھے جگاؤ تو نہیں..“  
چی پچی یکدم خوفزدہ ہو کر پیچپے ہٹ گیا۔

”میں پھر سے گھر جانا چاہتا ہوں.. میں گھر میں تھا اور تم نے مجھے جگا دیا.. میرے کمرے میں گیس ہیٹر جل رہا تھا اور میرے بدن کے ایک ایک روئیں میں اُس کی گرمی اُترتی تھی اور مجھے سکھی کرتی تھی.. ماں میرے لیے گرم دودھ لینے کئی تھی اور تم نے مجھے جگا دیا.. اب میں پھر سے سرد ہونے لگا ہوں.. مجھے سونے دو“

مرتضی بیگ عمر میں اُن سب سے بڑا تھا.. کم از کم دس برس بڑا تھا اسی لیے اپنے آپ کو اُن سب کے لیے ذمہ دار سمجھتا تھا.. اُن سے کہیں زیادہ تقاضہ کامارا ہوا اور نذر حال تھا اور بچوں کی طرح انہیں ڈانتا بھی تھا اور اُن کا خیال بھی رکھتا تھا.. وہ بمشکل اٹھا اور ہاشم کے پاس جائیٹھا.. ”ہاشم..... ہمت کرو“  
”مجھے سونے دو..“

”ہاشم.. اُس ڈنر نام..“  
ہاشم جو ابھی اوپنگھا کسما تھا اپنے آپ کو سنبھالتا اٹھ بیٹھا ”میری ماں بھی یہی کہا کرتی تھی.. اُس ڈنر نام..“

”میں ماں ہوں ہاشم.. اٹھو..“ اس نے اپنالا تھ آگے کر دیا ”آ جاؤ..“  
ہاشم نے نیند سے بیدار ہونے والے ایک بچے کی مانند دونوں ہاتھ اور پا اٹھا دیئے.. ایک پچی کی گرفت میں آیا اور دوسرے کو مرتضی نے جکڑ لیا اور وہ اسے گھسیتے ہوئے ”ڈنر“ کے پاس لے آئے..

”ڈنر“ بہت بڑا اور اکڑا ہوا تھا اور اس کی چاروں ٹانگیں زمین سے اٹھی ہوئی لگتی تھیں...

جانی اُن سے ذرا الگ تھا.. اللہ بخشن۔ وہاب اور گل شیراس کے قریب  
تھے..

”مگر ٹوٹے کو کیسے اور کہاں سے کھایا جاتا ہے یارا..“ گل شیر شاید کوشش  
کر چکا تھا ”اس کا جلد تو بہت سخت ہے چڑے کے موافق ہے اس میں دانت گاڑھ  
کر گوشت کا بوٹی تو الگ نہیں کیا جاسکتا..“

”تم نے کوشش کیا ہے خال صاحب..“

”نہیں یارا.. بس ہاتھ لگا کر اندازہ کیا ہے.. چڑے کے موافق ہے..

کیسے کھائے گا؟“

”یہ ڈر تو نہیں ہے..“ ہاشم نے ہاتھ بڑھا کر اُسے چھوا..“ یہ تو  
ٹھنڈا ہے“ وہابھی تک نیم غنوڈگی کی کیفیت میں تھا..

مرتضی بیگ نے اپنی بیٹی میں سے ایک چھوٹا سا خبر نکالا جو اس نے  
کلوڑ کو مبیٹ یعنی دست بدست لڑائی کے لیے سنچال رکھا تھا اور اس کی دھار پر  
ابھی تک اس شخص کا خون جما ہوا تھا جو قندوز میں اس کی خندق میں کوکر اس کے  
گلے کی جانب ہاتھ بڑھاتا تھا ”بہت برس پہلے جنوبی امریکہ کے برف پوش پہاڑی  
سلسلے اینڈیز میں ایک جہاز کریش ہوا تھا.. اور چند ایک جو نجع گئے تھے انہوں نے  
محور آپنے مردہ ساتھیوں کا گوشت کھا کر اپنے آپ کو زندہ رکھا تھا..... ایک ناول  
لکھا گیا تھا ”الائیو“ ... میں نے وہ ناول پڑھا تھا.. نہ پڑھتا تو آج یہ نہ جانتا کہ ہمیں  
کیا کرنا ہے .. جو زندہ نجع گئے تھے انہوں نے اپنے ساتھیوں کی لاشوں کے چربیلے  
حصے چاقو سے کاث کر .. ان کے باریک پارچے تراش کر انہیں نگل لیا تھا.. ہم بھی  
ایسا ہی کریں گے..“

”واللہ..“ عبد الوہاب بولا ”اوپر تہہ خانے کی چھت کے اوپر صحن میں  
جو ہمارے رفیق پڑے ہیں تو بیکار پڑے ہیں .. ہم ان کا گوشت کیوں نہ کھالیں .. وہ

اس گھوڑے سے تو کہیں نرم ہو گا..”

”وہاب..“ مرتضی جھنجلا گیا ”ابھی تم اس گھوڑے کے حرام یا حلال ہونے کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھے اور ابھی تم اپنے دوستوں کی لاشیں کھا جانے کے بارے میں سنبھیدہ ہو رہے ہو..“

”نہیں..“ وہاب کا چہرہ اندر میرے کے باوجود پیلا پڑ گیا اور دکھائی دیا ”میرے اندر کڑواہٹ بھر گئی تھی اور میں ایک بھوٹانڈ مذاق کرنے کی کوشش کر رہا تھا.. میں کسی بھی لاش کی.. اور اپنے کسی رفیق کی لاش کی بے حرمتی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا.. زندگی مجھے قطعی طور پر عزیز نہیں اور اتنی عزیز نہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کے نمرے کھا جاؤ.. میں تو.. بیوقوفی میں ایک مذاق کر رہا تھا..“

”تم اگر مذاق سے فارغ ہو جاؤ تو میں گھوڑے کے پارچے تراشنے کی کوشش کروں اگرچہ یہ مکروہ ہے“ مرتضی شدید غصے میں تھا ”اس جانور کی پشت پر بیٹھے ہوئے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس کی جلد کا چڑا اتنا سخت ہو گا کہ اسے ایک خبر سے کاشنے کے لیے بھی اتنا زور لگانا پڑے گا..“ تم سب خاموش ہو گے تو میں یہ کوشش دوبارہ کروں گا..“

وہ سب وہاب کے سوابوںے تو نہیں تھے لیکن مرتضی طیش میں تھا اس لیے چپ رہے۔ ادھر ادھر سرک کر ڈھنے گئے.. ویسے بھی ان میں جتنی سکت تھی وہ گھوڑے کے قریب آنے میں اور کچھ کہنے میں صرف ہو چکی تھی..

مرتضی اپنے مختصر خبر کو ایک آری کی مانند مسلسل چلا رہا تھا لیکن گھوڑے کی جلد اتنی ڈھینت تھی کہ اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا..

دھوپ اٹھنے لگی تھی..

تیسری سیر ہی سے اٹھ کر پہلی سیر ہی تک واپس ہو چکی تھی..

مرتضی گھوڑے کے سخت اور سرد بدن پر خنجر کو چلاتا تھا اور جیسے اس کی دھار ٹکنڈ ہو چکی تھی .. جیسے وہ سنگ مرر پر چلتا ہوا سے کاٹ نہ سکتا ہو .. پھسلتا ہوا اور ایک خراش بھی نہ لگا سکتا ہو ..

ہاشم پھر سے اوپنے لگا تھا اور بریڈ فورڈ میں اپنے گھر کے دروازے کے باہر کھڑا تھا .. جس کے اندر اس کے کمرے میں گیس ہیر جل رہا تھا اور وہ جلد از جلد سردی سے اکثرے ہوئے اپنے بدن کو اس کے قریب لے جانا چاہتا تھا .. جانی لا تعلق تھا ..

البتہ پیچی - وہاب - اللہ بخش اور گل شیر نتیجے کا انتظار کر رہے تھے ..

تب ان کے کانوں میں کچھ انسانی آوازیں آئیں ..

وہ دم رو کے ایک سکوت بھرے سنائے میں چلے گئے ..  
کون ہو سکتا ہے ؟ ..

اوپر کچھ صحن میں کچھ لوگ چل پھر رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے ..

تہہ خانے کی چھت پر ان کے قدم پڑتے تھے تو ان کی دھمک سنائی دیتی

تھی ..

آن کی باتیں .. بلکہ باتوں کی بھجنناہٹ پہلی سیرھی پر جا چکی دھوپ کو روندتی ہوئی نیچے تہہ خانے میں آ رہی تھی ..

آن میں سے کسی ایک کاسا یہ پہلی سیرھی کی دھوپ میں سے گزرتا تھا ..

مرتضی کا خنجر گھوڑے کی پشت پر جہاں تھا .. رُکا رہا ..

آن سب کی نظریں پہلی سیرھی کی دھوپ پر چپکی ہوئی تھیں ..

کسی بھی بد قسمت لمحے اس سیرھی پر کوئی بوٹ یا جو گر پڑ سکتا تھا اور نیچے

آن تک آ سکتا تھا ..

وہ سمجھی مسلح نہ تھے ..

انہوں نے تو اپنے ہتھیار ڈال دیئے تھے..  
 ہاتھوں کو پشت پر باندھنے کی جو کارروائی شروع ہوئی تھی اس کے فوراً  
 بعد بھگلڈڑ میں ان کے ہاتھ صرف تین کلاش نکوفیں لگی تھیں..  
 انہیں اپنے آپ کا پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں پڑے ہیں.. ان کا کیا پتہ ہوتا کہ وہ  
 تہہ خانے میں کہاں پڑی ہیں..  
 لیکن ان میں انہیں گھوڑے کی سرد ہو چکی لید اور پیشاب میں سے ٹول  
 کر ان کی نالیوں کا رخ پہلی سیرھی کی ڈھوپ کی جانب کرنے کی توانائی آگئی..  
 وہ دم رو کے اپنی آنکھیں پہلی سیرھی پر ثابت کیے منتظر ہے..  
 یہاں تک کہ ہاشم بھی غنوڈگی سے مکمل طور پر باہر آگیا.. اپنے گھر کے  
 دروازے سے واپس آگیا..  
 شاید وہ لاشیں اٹھا رہے تھے..  
 یاؤں کے بُوٹ اور سونے کے دانت اتار رہے تھے..  
 یالاشوں کے اس پارک میں چھل قدمی کے لیے آگئے تھے..  
 تہہ خانے میں ایک حدت بھرے گھر کی آسودگی ہو گئی.. ان کے زخم  
 مندل ہو گئے..  
 ان کے بدنوں میں جو گولیاں ٹھہری ہوئی تھیں جو آہنی مکڑے پناہ گزیں  
 تھے وہ گھل گئے اور وہ پہلی سیرھی پر نظریں جمائے ہو شیار اور چوکنے ہو گئے..  
 مرتضی کا خبر اس کی گرفت میں گھوڑے کی پشت پر رُکا رہا..  
 سانس بھی شاید رکے رہے..

ٹھوڑی دیر بعد.. جب ان کے حساب میں صدیاں درج ہو گئیں تو پہلی  
 سیرھی کی ڈھوپ میں سے جو ایک سایہ بار بار گزرتا تھا بہت دیر تک نہ گزرا..  
 آوازوں کی بھجن صناہٹ ختم ہو گئی.. تہہ خانے کی چھت پر جو چلتے پھرتے باتیں